ڈاکٹر خورشید رضوی کی شاعری (ایک مطالعہ)

ڈاکٹر نازیہ راحت

ABSTRACT:

Dr. Khursheed Rizvi is the most renowned figure of Urdu literature. The history of Urdu poetry cannot be completed without mentioning the name of Dr. Khursheed Rizvi: He wrote memorable books in fields of fiction translation, Criticism, Arab culture and history. In this article, except all these fields, his another field of creation, ''Poetry'' will be discussed.

کوئی بھی شاعر اپنی شاعری کے ابتدائی مراحل میں روایت سے ضرور اثر پذیر ہوتا ہے یہ صلاحیت ہر مثبت انسان میں بدرجہء اتم موجود ہوتی ہے۔ تخلیقی اُٹھان میں ماضی اور معاصر شعراء کے کلام سے فیض یاب ہونا تنوع کا پیش رو ہے۔ کسی بھی زباں کے ادب سے متاثر ہونے کا مطلب یہ نہیں ہماری اپنی ادبی شناخت ختم ہو گئی بلکہ اس سے ہماری تہذیب، روایت کے سوتے خشک ہونے سے بچ جاتے ہیں اور تخلیقی صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ ادب میں شاعری کی صِنف اپنے مخصوص لب و لہجے میں دو مصرعوں میں پوری تہذیب و ثقافت کا عکس دکھاتی ہے۔ اسی تناظر میں عہد حاضر کے شعراء میں یہ روایت خاصی جاندار دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر خورشید رضوی بصیرت عبقری ہیں جو اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور منکسر المزاج انسان، بلند پایہ شاعر، محقق، مترجم، نقاد، شخصیت نگار اور عربی دان ادیب ہیں، شخصی خوبیاں خامیاں ہر انسان کی ذات کا جملہ پہلو ہیں لہٰذا خورشید رضوی بھی ان سے مبرّا نہیں ہوں گے، بتدریج انہیں سازگار حالات بھی میسر آتے گئے اور یوں وہ ایک ادبی سفر کی طرف رواں ہو گئے جماعت اسلامی سے وابستگی کی وجہ سے متعلمین ور فقائے کار کا

(۲)

ایک مخصوص حلقہ بھی اُن کا ہم قدم و ہم سفر ہے۔

خورشید رضوی کی علمی و ادبی کاوشوں پر تحقیقی مقالات لکھے جا چکے ہیں تاہم اس مضمون میں ان کی ایک اور تخلیقی جہت "شاعری" کے حوالہ سے بات کی جائے گی۔

خورشید رضوی کی شاعرانہ زندگی کا آغاز لڑکپن سے ہی ہو گیا تھا، اس حوالے سے وہ خود بتاتے ہیں۔

"میری شاعرانہ زندگی کا آغاز دس بارہ برس کی عمر میں ایک شعر سے ہوا ریلوے اسٹیشن منٹگمری (۲) کے اُس چھوٹے سے کوارٹر میں ایک کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر ایک شعر کا نوٹ بک میں لکھنا مجھے اب تک یاد ہے، شعر یوں تھا:

ہر شب کو فلک پر ہیں چمکتے ہوئے تارے
خورشید نکلتا ہے تو چھپ جاتے ہیں تارے

بعد ازاں کچھ گھریلو تقریبات کی مناسبت سے انہوں تہنیتی اشعار سہرے، سہاگ وغیرہ لکھے لیکن انہیں محفوظ نہ رکھا، اٹھارہ انیس برس کی عمر سے لے کر پچیس تیس برس تک کی شعری کاوشوں کا انتخاب ان کے شعری مجموعے "شاخِ تنہا" (۴) میں شامل ہے جو صرف غزلیات پر مشتمل ہے۔

شاعری میں صرف جذبہ ہی نہیں اور بھی کئی عناصر شامل ہوتے ہیں جن میں تخیل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

"خورشید رضوی اگرچہ ستر کی دہائی سے بہت پہلے مطلع سخن پر نمودار ہوئے اور اپنے کلام کی نفاست اور لہجے کی ندُرت کے باعث مقبول ٹھہرے مگر ان کا اسلوب خاص جو اُن کی شناخت کا وسیلہ بنا، ستر کی دہائی میں اپنی تکمیلی صورت میں ظاہر ہوا، غزلیہ روایت کے تہذیبی عناصر اور فکر و فن کے کامل ادراک کے باعث انہوں نے جدید تر غزل کی داغ بیل ڈالی۔اُن کی غزلوں میں "جدید غزل" کی مخصوص چاردیواری سے باہر نکل کر نئی منزلوں کی طرف بڑھنے کی کیفیت واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔(۵)

(۳)

یہی ہے عشق کہ سر دو، مگر دہائی نہ دو
وفورِ جذب سے ٹوٹو، مگر سنائی نہ دو
زمین سے ایک تعلق ہے ناگزیر مگر
جو ہو سکے تو اُسے رنگ آشنائی نہ دو
یہ وہ دور ہے کہ بیٹھے رہو چراغ تلے
سبھی کو بزم میں دیکھو مگر دکھائی نہ دو
نہ جانے کب نہ رہیں ہم ہمیں غنیمت جان
حیات و موت میں کچھ ایسا فاصلہ بھی نہیں

"خورشید رضوی نے مشرقی زبانوں بالخصوص عربی اور فارسی کے ادبیات کے مطالعے سے اظہار کے ان وسیلوں سے فائدہ اٹھایا جو عام غزل گو شاعروں کی نگاہوں سے اوجھل رہے ہیں ان کے علم و فضل نے بہ قول مظفر علی سید ان کی شاعری کو نقصان نہیں پہنچایا بلکہ ثروت مند کیا ہے۔(۶)

دل کے معاملوں میں زباں معتبر نہیں
ہے معتبر نظر سے نظر کا کہا ہوا
راستے اور بھی تھے تیری گلی تک لیکن
ہم کو وحشت کے کڑے کوس پسند آئے ہیں

"خورشید رضوی نے تشبیہات واستعارات اور علامات واشارات کے اچھوتے اور کم یاب رنگوں سے غزل کی زیب و زینت میں اضافہ کیا ہے۔زبان و بیان پر کامل گرفت اور لفظیات کے استعمال کا شعور ان کی قدرت کلام کا مظہر ہے(۷) "

(۴)

تم صبا کی طرح آئے اور رخصت ہو گئے
ہم مثالِ شاخِ تنہا دیر تک لرزاں رہے
مدت ہوئی کہ دل سے تیرا نقش اُڑ گیا
اب دیکھیں کس کا نام کُھدے اس نگینے میں
ہم تجھ سے گریزاں بھی اگر ہیں تو اِسی طور

جس طرح کوئی شاخ گریزاں ہو شجر سے۔

اس مجموعے میں شامل غزلیات کلاسیکی اور رومانوی احساسات کی ترجمان ہیں۔

کب نکلتا ہے کوئی دل میں اتر جانے کے بعد
اس گلی کے دوسری جانب کوئی رستا نہیں
تم سمجھتے ہو بچھڑ جانے سے مٹ جاتا ہے عشق
تم کو اس دریا کی گہرائی کا اندازہ نہیں

دل میں وہ جابسا، رگ جاں کاٹا ہوا لو آج ہم نے آنکھ سے دیکھا، سنا ہوا یوں یوں تراشوں گا غزل میں تیرے پیکر کے نقوش وہ بھی دیکھے گا تجھے جس نے تجھے دیکھا نہیں

ذاتی تجربے کو عمومی جہت دینا ہی شاعری کی معراج ہے۔"خورشید رضوی" کی شاعری فرد اور اجتماع کی عکاسی کرتی ہے۔

مصالحت بھی نہیں ہے سرشت میں اپنی
مگر کسی سے تصادم کا حوصلہ بھی نہیں
خواب کو تعبیر ملتی ہے غموں کو اعتدال
ہوش میں شامل اگر تھوڑی سے بے ہوشی رہے

(۵)

"خورشید رضوی کی غزل بھی کلاسیکی معیارات کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے ان کی غزل سرائی کے ابتدائی دور میں لسانی تشکیلات کے رجحانات نے "جدید غزل" کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اس دور کے اکثر غزل گو شعراء جدت کے شوق میں مختلف زبانوں کے الفاظ کو غیر فن کارانہ انداز سے غزل میں شامل کر کے داد وصول کر رہے تھے، اس دور میں اُن رجحانات سے اپنے آپ کو بچالینا آسان کام نہ تھا۔ خورشید رضوی ان معدودے چند تخلیق کاروں میں شامل ہیں جنہوں نے ان لسانی رجحانات کے کھوکھلے پن اور سطحیت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو ان سے الگ رکھا، انہوں نے غزل کی پُرانی لفظیات میں معنویت کی تازگی شامل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ فن کے اسرار و رموز سے آشنائی کے باعث تخلیق کار گھسے پٹے الفاظ کے قالب میں بھی نئی روح پھونک کر انہیں حیاتِ نو کی لذت سے سرشار کر سکتا ہے۔(۸)"

لبوں پہ آج سرِ بزم آگئی تھی بات
مگر وہ تیری نگاہوں کی التجاء کہ نہیں
پل بھر کو اگر وقت کا سیلاب تھمے، آ
دم بھر کو اگر وقت پہ کچھ زور چلے ، مل

ہر انسان وقت کے ساتھ بتدریج ارتقاء پذیر ہوتا ہے۔ شاعر جو معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے اس کے لئے فکری ارتقاء سے مفر کیسے ممکن ہے شعری مجموعوں کے نام بھی اس ارتقاء کے ترجمان ہوتے ہیں۔

"سرابوں کے صدف "(۹) شاعر کی ذات حقیقت پسندی کا مظہر دکھائی دیتی ہے اس میں مناجات، نعت، غزلیں اور نظمیں شامل ہیں لیکن زمانی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا لہٰذا اس میں "شاخ تنہا" سے پہلے کی شاعری بھی شامل ہے۔ شاعر نے غزلوں اور نظموں میں لفظ دل کو مختلف معنوں میں برتا ہے۔

(۶)

کوئی نہیں ہے جو ان سیپوں کو کھول سکے
پڑے ہیں لاکھ سخن ہائے گفتنی دل میں
مسافت کٹ چکی کب کی، مگر درپیش ہے دل کو
سفر کے بعد اب یاد سفر درپیش ہے دل کو
سب سخن میں بھی نہ سمٹیں گے خزینے دل کے
دفن دل ہی میں رہیں گے یہ دفینے دل کے

زیر نظر مجموعے میں شاعر نے دل کو محض بطور استعارہ استعمال نہیں کیا بلکہ اسے انسانی وجود کے طور پر ایک نئی دنیا سے متعارف کروایا ہے۔

نئے علوم خلاؤں میں راج کر لیں گے
مگر یہ دل کے سمندر نہیں بلونے کے

دل کی دو ہی کیفیات ہوتی ہیں خوشی یا غم۔ یہ ہماری سوچ اور فکر پر منحصر ہے کہ دل کو آسودہ کرتے ہیں یا غمگیں۔ دبستان دِلی کے نمائندہ شاعر میر درد نے زندگی کی رعنائی کو دل سے مشروط قرار دیا ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

گویاانسانی جذبات کے موضوعات تو صدیوں سے ایک جیسے چلے آرہے ہیں لیکن یہ شاعر کا پیرائیہ اظہار ہے جو انہیں نیااور پر کشش بنا دیتا ہے۔ شاعرانہ فکر فطرت کی دین ہے لیکن بتدریج تہذیبی اور ثقافتی عمل سے ثروت مند ہوتی ہے موضوعات میں تبدیلی یکسانیت سے بچاتی ہے خورشید رضوی مجید امجد سے بہت متاثر ہیں اس کی بازگشت ان کی شاعری میں بھی سنائی دیتی ہے زیر موضوع مجموعہ میں شامل بیاد مجید امجد کے تحت لکھی گئی غزلوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مجید امجد کی شعری روایت کی ترویج کے خواہاں ہیں۔

(۷)

پلٹ کے صبح کا سورج تو روز آئے گا
مسافر "شب رفتہ "کبھی نہ پلٹے گا
اس کی دیکھتے ہیں راہ سب جو کہتا تھا
میں جب ادھر سے نہ گزروں گا کو ن دیکھے گا
کوئی سنے تو خموشی ہے گفتگو ان کی
کہ صد زبان بھی ہیں یہ بے زباں گلاب کے پھول

شاعر کے اندر ہمہ وقت ایک کش مکش جاری ہے وہ متضاد کیفیات کا شکار دکھائی دیتا ہے۔

میری سر شت میں زندگی سے بیزاری
تیرے ستم تو بہانے تھے ہاتھ دھونے کے

زیرِ تبصرہ مجموعہ میں شامل نظموں میں شاعر کی نفسیاتی کیفیت کھل کر سامنے آتی ہے دل اور متعلقات دل کو انہوں نے اپنی شاعری میں خوب برتا ہے موجودہ دور میں انسان ایک دوسرے سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں ایسا کیوں ہے اس کے لئے ہر ایک کو اپنے اندر جھانکنے کی ضرورت ہے۔ خورشید رضوی بھی اپنی اندرونی کیفیت کو دل کے استعارے میں بیان کرتے ہیں۔

اس حوالے سے انکی نظموں "دعائے نیم سنگ" "دل کو جانے" "چل اے دل آسماں پہ چل" "دل تو اب یہ چاہتا ہے " "اورینٹل کالج کے لئے ایک نظم" میں یہ کیفیت نظر آتی ہے۔

(۸)

دل کو جانے یہ دُھن کیا ہے
دنیا سے الگ ہو جانے کی
اپنے اندر کھو جانے کی
دل کو جانے یہ دُھن کیا ہے
دل اب تو یہ چاہتا ہے
رشتہ سب سے توڑ کے
دنیا سے منہ موڑ کے
جا نکلے اُس اور
جہاں چلے نہ کوئی زور
(دل کو جانے)

00-00-01-85-01- شاعر نے ایک ایسی دنیا میں جانے کا اظہار کیا ہے جو اس دنیا سے بالکل مختلف ہو لیکن آخری لائن میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ شاعر خواہش مرگ کر رہا ہے لیکن دوسرا بند دیکھیں اس میں وصلِ محبوب کی خواہش ہے۔

کوئی نفی ہو اور نہ کوئی اثبات
دُور دُور تک دیئے جلائیں
کھلتے پھول ۔۔۔۔۔اور راس رچائیں
جھومتے جھونکے ، دفیں بجاتے پات
اور میرے ٹھنڈے شانے پر
خوشبو ایسا اِک نادیدہ ہات
پاگل دل تو اب یہ چاہتا ہے

نظموں کے آخری حصہ میں شامل "نوحے" اپنے عزیزوں کی موت پر شاعر کے تاثرات ہیں جو اشعار میں ڈھل کر نوحوں کی شکل اختیار کر گئے ہیں جو بقول شاعر

(۱۰)"یہ نوحے کسی بھی موت پر کسی بھی انسان کے تاثرات ہو سکتے ہیں"

(۹)

"اکیس اپریل" اس کو شاعر نوحہ کہتا بھی ہے اور نہیں بھی کیونکہ وہ اسے تسخیر مرگ کی مثال قرار دیتا ہے۔

موت نے پہلے جھک کر
قدم اس کے چومے
پھر اس سرد بوسے سے یخ بستہ ہوتی ہوئی جوئے خوں میں بہی
اور اُس قلب بیدار کے سات چکر لئے اور اس ذہنِ
براق کی نور ہی نور دہلیز پر آکے ٹھٹکی

قاضی عبدالنبی کوکب "جواں سال عالم دین اور شاعر کے بے تکلف دوست تھے اور نیٹل کالج میں عربی کے استاد تھے سڑک پار کرتے ہوئے ایک حادثے میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔

ایک ہی پل میں اڑ گئیں کیسے کیسے علوم کی کرچیں
ریزہ ریزہ جن کا تو نے کاسۂ سر میں دان لیا تھا

مٹتی ہوئی تحریروں سے اور پارہ پارہ جھڑتی ہوئی کتابوں سے آخری دو نوحے شاعر نے اپنی خالہ کی اچانک وفات پر لکھے۔

تو دیکھنے میں مائل شوق سفر نہ تھی
ایسا سفر کرے گی کسی کو خبر نہ تھی
اے مادر شفیق سے مجھ پر شفیق تر
میرے نصیب میں تیری گرد سفر نہ تھی
تنہائیوں کو دیدۂ پر آب دے گئی
یعنی صدف کو گوہر نایاب دے گئی
دل پر کُھدی ہوئی وہ تیری صورت شفیق
بے خواب ساعتوں کے لئے خواب دے گئی

ان نوحوں پر تبصرہ کرتے ہوئے رفیق سندیلوی لکھتے ہیں۔

(۱۰)

"خورشید رضوی نے شاعر ہونے کے ناطے موت کے عام تجربے سے کچھ ہٹ کر اظہار کیا ہے اور اپنے وجود کو کسی حد تک اپنے عزیزوں کی مساویانہ اور نیم مساویانہ رفاقت کے جذبوں میں بندھا ہوا محسوس کیا ہے لیکن پھر بھی یہ نوحے اس کی ذات یا کسی بھی انسان کی ذات پر عمومی طور پر اثر انداز ہونے والی موت کے صدماتی اظہار سے آگے نہیں بڑھ پائے اور موت کی جابر و قاہر حقیقت کی سنگین موجودگی اور اٹل بے رحمی سے پیدا ہونے والے غم کی متلاطم لہر کو ذہن و قلب کی سالم سطح پر نمایاں کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے البتہ نظم "اکیس اپریل "اپنے اندر تکنیکی مہارتیں لئے ہوئے ہے اور باطنی اظہار کی اکہری سطح کو توڑ کر عمق تک چلی گئی ہے (۱۱)

خورشید رضوی نے اپنی نظموں میں واردات قلبی کا ذکر جس خوب صورت انداز سے کیا ہے وہ قابل تعریف ہے وہ لفظوں سے ایسی پیکر تراشی کرتے ہیں کہ ایک مجسم صورت ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

"رائگاں "(۱۲)۔

یہاں زندگی کے بیتے پلوں کی رائیگانی کا احساس جابجا ملتا ہے اور حقیقت پسندی کا عنصر نمایاں ہے۔

اس مجموعہ کلام کے حوالے سے منیر نیازی کی رائے انتہائی معتبر ہے

"پاکستان میں دو طرح کے شاعر ہیں ان کی ایک قسم ہر وقت اور ہر دم صفحہ ظہور پر رہتی ہے ان کی ہستی اسی سبب سے ہے اور وہ اس سے یکسر غافل نہیں رہتے دوسری طرح کے شاعر نمائش شعر سے زیادہ تخلیق شعر میں مبتلا رہتے ہیں اور خورشید رضوی اسی دوسری قبیل کے شعراء میں سے ہیں کاروبار حیات ان کے لئے فقط کاروبار نہیں وہ اس سے ایک نئی حقیقت ایک طرز حیات نو کے بارے میں سوچتے اور اس کا اظہار کرتے ہیں اور ایسے شاعر دور موجود میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔(۱۳)

یہ شعری مجموعہ مناجات نعت، غزلوں، نظموں اور رباعیات پر مشتمل ہے غزلوں میں رومانوی آہنگ نمایاں ہے رومانیت شاعر کی روح میں رچی بسی ہے مختلف موضوعات کو اپنی شعری کائنات میں سمونے کے بعد شاعر پھر ماضی کی طرف لوٹ جاتا ہے جہاں وہ ہجر میں بھی وصال سے شاد کام ہوتا ہے۔ یہ غزل اس کیفیت کی بہترین عکاس ہے۔

(۱۱)

یوں تو وہ شکل کھوگئی گردش ماہ و سال میں
پھول ہے اک کھلا ہوا حاشیہء خیال میں
اب بھی وہ روئے دلنشیں، زرد سہی ،حسیں تو ہے
جیسے جبین آفتاب، مرحلہ زوال میں
اب بھی وہ میرے ہم سفر ہیں روش خیال پر
اب وہ نشہ ہے ہجر میں،تھا جو کبھی وصال میں

خورشید رضوی کے قلم میں اتنی جولانی ہے کہ وہ کبھی تسلسل اور تاثر کی یکجائی سے آراستہ نظم جیسی صنف تخلیق کرتا ہے اور کبھی یہی ربط چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تحلیل ہو کر غزل کا روپ اختیار کرلیتا ہے جو اس کی موضوعیت کی ترجمانی کرتی ہے۔

ان کی یہ شاہکار غزل جوہر ذی بشر کے احساسات کی ترجمان اور حقیقت نگاری کی عکاس ہے۔

یہ جو ننگ تھے یہ جو نام تھے مجھے کھا گئے
یہ خیال پختہ جو خام تھے، مجھے کھاگئے
میں عمیق تھا کہ پلا ہوا تھا سکوت میں
یہ جو لوگ محوِ کلام تھے ، مجھے کھا گئے
وہ جو مجھ میں ایک اکائی تھی وہ نہ جڑ سکی
یہی ریزہ ریزہ جو کام تھے مجھے کھا گئے
جو کھلی کھلی تھیں عداوتیں ، مجھے راس تھیں
یہ جو زہر خند سلام تھے مجھے کھا گئے

زندگی جہد مسلسل کا نام ہے یہاں دُکھ اور سکھ قدم ملا کر چلتے ہیں بظاہر انسان مشکل حالات کا سامنا مسکرا کر کرتا ہے لیکن اندر سے وہ تبدیل ہو جاتا ہے اور اس تبدیلی کے اثرات بعض اوقات اس کے چہرے سے بھی عیاں ہونے لگتے ہیں۔

شاعر نے اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔

(۱۲)

یہ خدوخال نہیں تھے اپنے
پیش آئے ہمیں حالات عجیب

دنیا میں جو اہل دل رہے ہیں
آزردہ وہ مستقل رہے ہیں
کچھ دل میں بھی صبر کی کمی تھی
کچھ زخم بھی جاں گُسل رہے ہیں
کیوں آج بجھے بجھے ہو خورشید
یہ رنج تو متصل رہے ہیں
کہنے کو ہم ہر ایک ستم سے گزر گئے
گزرے کہاں ہیں، روح میں انبار جالگا

خورشید رضوی کی شاعری میں لطافت اور مٹھاس ہے وہ تلخ لہجے میں بات کرنے اور سننے کے عادی نہیں۔

موت قبول ہے مگر تلخی لب نہیں قبول
زہر بھی شوق سے پلا، ہاں مگر انگبیں کے بعد

عاجزی اور منکسر المزاجی خورشید رضوی کی شخصیت کا خاصہ ہے لیکن کوئی بھی باشعور فرد اپنی فنی قدر و قیمت سے ناواقف نہیں ہوتا یہ احساس اس کے اندر سرایت کر رہ جاتا ہے خورشید رضوی اس کا اظہار کچھ اس طرح سے کرتے ہیں۔

ہوگا نہ سوگوار میرے واسطے کوئی
جلتا ہوا دیا ہوں سحر چھوڑ جاؤں گا
مجھ سے محروم رہا میرا زمانہ خورشید
مجھ کو دیکھا، نہ کسی نے مجھے جانا

یہ مجموعہ کلام گوناں گوں موضوعات کا مجموعہ ہے شاعر کا دل حُب الوطنی کے جذبے سے بھی سرشار ہے اس کی مثال "سات سمندر پار وطن کی یاد" نظم ہے اس میں انہوں نے ننھے منے بچوں اور گل و گلزار کے مناظر کو دلکش انداز میں پیش کیا، موضوعاتی تنوع کی ایک اور مثال "افغانستان کے لئے نظم" ہے۔

(۱۳)

یہ شعری مجموعہ رنگا رنگ پھولوں سے مزین ایک گلدستہ ہے جس میں سے ہر فرد اپنی پسند کے مطابق پھول منتخب کر سکتا ہے۔

"امکان" (۱۴) حمد اس مجموعے کی پہلی نظم ہے جس میں قسام ازل کو "جان تنہائی" کہا ہے۔

جان تنہائی!
تغیر کے سمندر میں تیرا دستِ دوام
نور کے مینار کی صورت
میری ڈھارس بندھاتا ہے مدام

00-00-01-01s- یہاں شاعر نے بڑے منفرد اور اچھوتے انداز میں اللہ تعالی کی تعریف بیان کی ہے، شاعری دلکش پیرائے میں انسان اور کائنات کو ایک رشتے میں پروتی ہے، اور خورشید رضوی اس فن سے بخوبی آگاہ ہیں۔

خورشید رضوی روایت کے ساتھ ساتھ تخلیق کاری میں جدت کے بھی قائل ہیں انہوں نے حلقہ ارباب ذوق کے ۲۰۰۳ء کے سالانہ جلسے کے خطبہ صدارت میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

"روایت کے سانچے جب فرسودگی میں ڈھلنے لگتے ہیں تو تخلیق کی تازہ کاری انہیں توڑ ڈالنے کی ضرورت بھی محسوس کرتی ہے اور یقیناً اس کا حق بھی رکھتی ہے لیکن اصولی طور پر کسی بھی روایت کو توڑنے یا رد کرنے کے لئے اس کا علم اور اس پر قدرت رکھنا شرط ہے چنانچہ خود روایت شکنی کے لئے روایت کو جاننا اور عملاً اس پر قادر ہونا ضروری ہے اس علم اور قدرت کے بغیر روایت کے خلاف بغاوت کا نعرہ دراصل اپنی کمزوری کو چھپانے کا ایک بہانہ ہوتا ہے۔(۱۵) "

اس مجموعہ کی شاعری روایت اور جدت کا سنگم ہے کیونکہ وہ ایک با عمل شاعر ہیں اور ان کے گھرانے کی روایت اور رہائش امروہہ سے وابستہ ہے اور وہ خود لاہور سے ہیں۔

ان کی شاعری میں تازگی کا احساس نمایاں ہے ان کا شعری اسلوب بھرپور اور مختلف ہے عشق اور دل کی وارداتیں شاخ تنہا سے شروع ہوتی ہیں اور "امکان" تک پھیلی ہوئی ہیں۔

(۱۴)

دل وہ پاگل ہے کہ ہوجائے گا غرقاب وہیں
جھیل کی تہہ میں اگر عکس قمر پیدا ہو
دل پہ اب شہر خموشاں کی خموشی ہے محیط
کچھ بھی حاصل نہیں اے ولولہ انگیز ہوا

اس کا مطلب یہ نہیں کہ خورشید رضوی کی شاعری محض دل کی کیفیات کی ہی مظہر ہے انہوں نے اور بے شمار مضامین باندھے ہیں ان کے اندر انقلاب زمانہ کی خو بھی ہے۔

ہوا کے زور پہ چلنا بھی چاہیئے کچھ کچھ
مگر ہوا کو بدلنا بھی چاہئیے کچھ کچھ
زمانے کو جو ہمیں ڈھالتا ہے سدا
ہمارے رنگ میں ڈھلنا بھی چاہیئے کچھ کچھ

" خاک " کی ردیف سے اُن کی ایک بڑی فکر انگیز غزل ہے

گل کھلاتی ہے کبھی خاک اڑاتی ہے یہ خاک
شعبدے کرتی ہے ، نیرنگ دکھاتی ہے یہ خاک
سال ہا سال کھلاتی ہے جسے رزق اپنا
آخر کار اُس انسان کو کھاتی ہے یہ خاک
سب سے آخر میں اُبھارے تھے جو رفتہ رفتہ
سب سے پہلے وہ خدوخال مٹاتی ہے یہ خاک
ہے کبھی جسم، کبھی قبر کی مٹی خورشید
جس طرف جاؤں ، میری راہ میں آتی ہے یہ خاک

ہر انسان کے اندر یہ خواہش پنہاں ہے کہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا جائے خواہ وہ کتنا ہی عُزلت پسند کیوں نہ ہو، انہی احساسات کا اظہار خورشید رضوی نے بھی کیا ہے۔

(۱۵)

ہم نمائش کے تو قائل نہیں لیکن خورشید
خود کو پنہاں بھی زمانے سے نہ کر پیدا ہو
کس کو دوں اپنی طبیعت کی وراثت خورشید
اک امانت ہے میرے پاس امیں نامعلوم
مجھ سے محروم رہا میرا زمانہ خورشید
مجھ کو دیکھا، نہ کسی نے مجھے جانا خورشید
خورشید ، سنا تو نے اُس بزم میں کل تیرا
وہ ذکر ہوا جس سے شرمائے فراموشی

خورشید رضوی کا اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان ہے، زندگی میں ملنے والی کامیابیوں کو اس کی عنایت قرار دیتا ہے۔

تیرے کرم سے قدم کو سہارتی ہے زمیں
میرا غرور سلامت تیرے کرم سے ہے

خیال میں ندرت، فکر میں گہرائی اور اسلوب میں لطافت سے اُن کی نظمیں مزیّن ہیں، مبالغہ آرائی کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اس مجموعے میں نظموں اور غزلوں میں رومانوی رچاؤ کے ساتھ ساتھ حقائق نگاری اور فکر کی گہرائی بدرجہ اتم موجود ہے۔ "دیریاب" (۱۶) خورشید رضوی نے ہر شعری مجموعے کا نام اپنے شعر سے منتخب کیا ہے۔

گزرا کرے سفید و سیہ سیل روز و شب
اک کنج دیر یاب میں سوئے ہوئے ہیں ہم

یہ مجموعہ غزلیات اور نظموں پر مشتمل ہے رفتگاں کے لئے بھی چند نظمیں شامل ہیں، آغاز میں حسب روایت حمد و نعت ہے۔

(۱۶)

تجھ سے جی لگتا ہے میرا، جان تنہائی ہے تو
میرے اندر کا جہاں ہے، دل کی گہرائی ہے تو
تیرے دم سے چار سُو نقش و نگار نو بہ نو
اور ان کے درمیاں احساس یکتائی ہے تو

دیریاب کی شاعری میں موضوعات کا تنوع ہے، داخلیت اور خارجیت کا خوب صورت امتزاج جابجا نظر آتا ہے، انہوں نے روایتی اسالیب کے ساتھ جدت کی لے کو بھی بھرپور انداز میں برتا ہے اُن کے تخیل میں نُدرت فطرت کی رعنائیوں کی مرہون منت ہے۔ غزلوں کے ساتھ انہوں نے نظمیں بھی تسلسل سے لکھیں ان کا ہر شعری مجموعہ اس کا آئینہ دار ہے۔ محبت کے ساتھ ساتھ امید اور رجائیت بھی ان کے موضوعات شاعری میں شامل ہیں کہیں کہیں شکوے اور بے بسی کی کیفیت بھی نظر آتی ہے۔

کیوں پہاڑوں کو امانت سے سبک دوش کیا

آدمی پر غم و آرام کی یورش کیوں ہے
تاب نظارہ نہیں اور ہوس دید میں لوگ
کاسہء آب میں سورج کا گہن دیکھتے ہیں
رائیگانی کا احساس ان کی شاعری میں جابجا ملتا ہے۔
ریت کی طرح نہ مٹھی سے پھسلتی چلی جا
اے میری عمر رواں ، یوں بھی نہ ڈھلتی چلی جا

زندگی کے فلسفہ پر بھی ان کی گہری نظر ہے وہ تقدیر کے لکھے کو ہی حرفِ آخر قرار نہیں دیتے بلکہ کوشش اور ہمت سے ہی تقدیر بنتی اور بگڑتی ہے۔

آدمی کی خصلتوں ہی میں ہے اس کی سرنوشت
ہے میرا رنگ طبیعت میری قسمت کی طرح
تو مشق ستم کر، تجھے کیا روزِ جزا سے
میں کشتہء ابرو ہوں میری داد نہ فریاد

خورشید رضوی نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی مختلف کیفیات کو شعری آہنگ میں ڈھالا ہے اسلوب اتنا دلکش ہے کہ قاری حیرت و مسرت میں گھر جاتا ہے۔

(۱۷)

اپنے ہونے کا پتہ دینے کی دُھن کیسی ہے
پاؤں جل جائیں مگر نقشِ کفِ پا چھوڑوں
محفل غیر میں بھی تجھ کو خراماں دیکھوں
زندہ ہے آنکھ تو کیوں ذوقِ تماشا چھوڑوں
سب کہے دیتی ہے اشکوں کی روانی افسوس
راز دل میں ہے کہ چھلنی میں ہے پانی افسوس
یہ زمانہ ہے یہاں سب ہے چلن پر موقوف
ابن منصور کو منصور کہا جانے لگا

شاعر کو اپنے جذبہ ءمحبت پر کامل اعتماد ہے، ناکامی کے باوجود وہ اُسے ایک نئے زاویے سے دیکھتے ہیں۔

ہم تیری راہ میں ناکام محبت ہی سہی
پھر بھی سیکھی ہے زمانے نے محبت ہم سے

جذبہ اور ہمت زندگی کی علامت ہے، بلند حوصلہ کامیابی کی دلیل ہے اور ناکامی بہت پیچھے رہ جاتی ہے وہ باری تعالیٰ سے بھی اسی رحمت کا طالب گا رہے۔

مجھے اسی بھیڑ میں ٹکرا کے چلنا ہے بہر گام الٰہی شیشہ ءدل کو حریفِ سنگ کر دے

طبیعت کو عطا کر دے کوئی بھرپور جذبہ
جو میرے شوق کو آزاد، نام و ننگ کر دے

جدت ادا کے ساتھ روایت کا رنگ بھی دَر آتا ہے

کبھی ہم بھی کسی کی بزم سے بسمل نکلتے تھے
سراپا چشم جاتے تھے سراپا دل نکلتے تھے

حصول منزل میں ناکامی زندگی سے جہد مسلسل کا جذبہ چھین لیتی ہے منزل میں ناکامی مایوسی کی کیفیت تو پیدا کرتی ہے لیکن انسان راہِ طلب میں جذبہ کامل کے ساتھ رواں دواں رہتا ہے شاعر نے بھی اپنی اسی کیفیت کو بیان کیا ہے جو فرد واحد کی نہیں بلکہ ہر فرد کی آواز ہے۔

(۱۸)

آج تک حسرت تعبیر میں دل جاگتا ہے
کتنا اچھا ہوا، کچھ خواب ادھورے ہی رہے

تنہائی پسندی اور افسردگی ہر اہل دل اور باشعور فرد کی طرح شاعر کی طبیعت کا بھی خاصہ ہے جو شعوری کوشش کے باوجود دامنِ شاعر سے الگ نہ ہو سکی۔

افسردگی طبع تجھے مان گئے ہم
ہم جان سے جاتے ہیں مگر تو نہیں جاتی
ظاہر پہ مسرت کا چھڑکتے ہیں بہت عطر
باطن سے اُداسی کی مگر بُو نہیں جاتی
غم ایام سے تھک کر تیرا دھیان آیا ہے
کیا کڑی دھوپ ہے اور کتنا گھنا سایہ ہے
خورشید تم نے نصف نہار شباب پر
جھپکی پلک تو بُرج کہولت میں آ گئے

زیر نظر مجموعے میں شامل نظمیں موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے بہت عمدہ ہیں ان میں "زمانے" "وہ تکمیلی زمانے" "زمانے سے باہر" ایک اچھوتے خیال کی مظہر ہیں۔

"منیر نیازی کا غم "

منیر نیازی کی وفات پر اسی کے رنگِ سخن میں لکھی گئی ہے۔

(۱۹)

اُمید کسی کے آنے کی
یا دُور سے بات سنانے کی
اَن دیکھی چھب دکھلانے کی
ہر بات میں دیر لگانے کی
اب ٹوٹ گئی

وہ نین نشیلے بند ہوئے
وہ صورت ہم سے روٹھ گئی

یہ نظم اسلوب بیان کا عمدہ شاہکار ہے اسی طرح دو نظمیں "ماں کے لئے ایک نظم "اور "ماں کی یاد میں ایک نظم "موضوع اور لفاظی کی عمدہ مثال ہیں۔

ماں جہاں بستی ہے ہر چیز وہیں اچھی ہے
آسماں! تیرے ستاروں سے زمین اچھی ہے
گھر آتا ہوں تو لگتا ہے یہ گھر وہ نہیں ہے
در و دیوار تو سب وہ ہیں مگر "وہ" نہیں ہے
اب جو گھبراؤں تو مدفن کی طرف جاتا ہوں
اُسی خاموشی میں کچھ دل کا سکوں پاتا ہوں

"نسبتیں "(۱۷)اس مجموعہ میں شاعر کا تمام نعتیہ کلام، دیگر مذہبی مثلاً حمد، منقبت، سلام اور مرثیہ بھی شامل ہے خورشید رضوی کی شاعری میں علم کا اظہار کسی مشکل پسندی کا باعث نہیں بنتا، ادبی چاشنی بدستور برقرار رہتی ہے۔ حمدیہ لہجے کے یہ اشعار۔

(۲۰)

تو پرندوں کو فضا میں تھامتا ہے دمبدم
بال و پَر کا زور، ہمت کی توانائی ہے تو
تو بصارت اور سماعت بخشتا ہے خاک کو
پیکروں کے درمیاں وجہ شناسائی ہے تو
ہے میرے ظرف سے باہر تیری عظمت کا تضاد
چھوڑ دے میرے لئے اپنے تنوع کا جلال
ایک ہی رنگ میں کچھ دیر میرے پاس ٹھہر

خورشید رضوی کے لئے اُن کی حمدیہ و نعتیہ شاعری اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑا انعام ہے جس کے لئے شکر گزاری کے جذبات سے سرشار ہیں۔

مجھ سے بن آئے گی کچھ نعت محمد ﷺ میں کہیں
ہوں ابھی مدحتِ سرکار ﷺ کی ابجد میں کہیں
سمجھو کہ سب دُکھوں سے شفا ہو گئی مجھے
جب دل دُکھا ہے نعت عطا ہو گئی مجھے
بانت سعاد و بُردہ پاکیزہ کے طفیل
حاصل مجھے بھی فیض ردائے رسول ہو

شعری تلمیحات کے ساتھ شاعر نے کعب بن زہیر کے قصیدے "بانت سعاد "اور امام بوصیری کے قصیدے "قصیدہ بُردہ" کا حوالہ پیش کیا ہے کہ مجھے بھی حضور ﷺ کے فیض سعادت نصیب ہو جائے۔

شاعر کو اپنے باطن کی آنکھ پر کامل یقین ہے اس کا اظہار نظم "تہہ دل" میں منفرد انداز سے کیا ہے "مدینہ میں "اس نظم میں شاعر مدینہ جا کر اپنے تاثرات عقیدت و محبت اور عشق رسول میں ڈوب کر صفحہ قرطاس پر بکھیرتا ہے۔

(۲۱)

کیا حسین گنبد و محراب ہیں لیکن مرا دل
ڈھونڈتا ہے وہی مٹی کے مکاں چھت پہ وہی عود نخیل
اور دروازوں پہ حجروں کے
سیہ اون کے پردے

"سلام و مرثیہ" میں شاعر نے شہدائے کربلا کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جناب امام حسینؑ کی مدحت بیان کی ہے۔

آتی نہیں بیان میں عظمت حسین کی
کیجئے زبان اشک سے مدحت حسین کی
جس میں نہ مصلحت ہے نہ کوئی مصالحت
وہ تیغ بے نیام ہے سیرت حسینؑ کی
اے حسینؑ ابن علیؑ تیری شہادت کو سلام
حرف حق جس کی تجلی سے فروزاں ہو گیا

شاعر نے جناب امام حسینؑ کو بچوں کے لئے جانثاری اور وفا کا پیکر بنا کر پیش کیا ہے اسلوب کی سادگی بدرجہ کمال ہے۔

حسینؑ نے ہم کو یہ سکھایا
کہ لاکھ ہو سر پہ غم کا سایہ
تم اپنے سر کو اٹھائے رکھو
قدم کو حق پر جمائے رکھو

"مناقب' کے عنوان کے تحت حضرت علی ہجویری داتا گنج بخش نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے اور بزبان فارسی حضرت فرید الدین گنج شکر سے خطاب کیا ہے اور آخر میں اپنے جدّ اعلیٰ حضرت ابوالفتح "شاہ ابّن کو خراج عقیدت پیش کیا ہے

(۲۲)

خورشید کی شاعری کا ہر رنگ اپنے اندر بے پناہ وسعتیں رکھتا ہے اور قاری کا جذبہ شوق کو مزید ہوا دیتا ہے ان کی شاعرانہ عظمت میں کوئی شبہ نہیں، ان کے چھ شعری مجموعوں میں سے پانچ کے پیش لفظ اور دیباچے ان کے قریبی احباب نے لکھے ہیں، دوستی میں مکمل معروضیت ممکن رہنا بہت مشکل ہے جو کہ تنقیدی نقطۂ نظر اور انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے کیا اس میں مصنف یا شاعر کی ذاتی منشا بھی شامل ہوتی ہے، چاہے جانے کا جذبہ دانستہ و نادانستہ ہر انسان میں کم یا زیادہ ضرور ہوتا ہے۔

کوئی بھی تحریر خواہ نثر ہو یا نظم اپنا وجود اپنے ماحول سے تخلیق کرتی ہے۔ کوئی فن پارہ خلاء میں تخلیق نہیں ہوتا۔ اسی طرح شاعری میں بھی شعور کو دخل ہے۔

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

''ایلیٹ کسی فن پارہ کو کوئی الہامی چیز تسلیم نہیں کرتا جو شدت، جذبات کے ساتھ ایک خاص شکل اور ایک خاص لمحے میں خود بخود وجود میں آگیا ہو وہ فنِ پارے کو ایک شے کی طرح سمجھتا ہے۔ جسے سوچ سمجھ کر ناپ تول کر سلیقے اور محنت سے تعمیر کیا جاتا ہے اور جس کا مقصد ایک مخصوص اثر پیدا کرنا ہوتا ہے۔''

)۱۸(

(۱۹)''شناخت''(قومی و ملی نظمیں)

یہ مجموعہ انتہائی مختصر ہے اس کی وجہ ڈاکٹر خورشید رضوی خود بیان کرتے ہیں۔

'یہ قومی و ملی منظومات بالعموم کسی نہ کسی موقع کی مناسبت سے یا کسی فرمائش کی تعمیل میں لکھی گئیں۔تاہم موقع اور فرمائش بھی اس بنسی کی طرح ہوتے ہیں۔ جسے مچھلیاں پکڑنے کے لیے پانی میں پھینکا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شکار تو وہی لگتا ہے جو پانی میں ہوتا ہے۔ یہ منظومات بھی میرے باطن کے حقیقی احساسات کے امین ہیں۔ میں ان مواقع اور فرمائشوں کا ممنوں ہوں۔ جنہوں نے مجھے خود اپنی ذات میں غوطہ لگا کر اپنے اندر کے اعماق کو کھنگالنے کی تقریب پیدا کی۔ان منظومات کی تعداد مختصر سی ہے۔ جنہیں ارسلان نے ایک کتابچے کی شکل دے دی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ''شناخت'' کے عنوان سے یہ کتابچہ خود مجھے یہ موقع فراہم کرے گا کہ اس مندرجات کو پڑھ کر اپنی شناخت کے عمل سے گزر سکوں۔ اگر یہ آپ کو بھی اسی عمل سے گزار سکے تو مجھے دلی مسّرت ہو گی(۲۰) ''

خورشید رضوی کے اس مجموعہ کلام میں متفرق موضوعات اور مختلف مواقع کی مناسبت سے لکھی گئی نظمیں ہیں۔ جو شاعر کی داخلی کیفیات کی آئینہ دار ہیں۔ قومی و ملی طور پر جو نشیب و فراز آئے۔اس کی وجہ سے شاعر کا حساس دل جس ذہنی المیے سے دوچار ہوا وہ مختلف موضوعات کے تحت لکھی گئی نظموں میں جابجا نظر آتا ہے۔ آغاز میں وہ اللہ تعالی سے رحمت کا طلبگار ہے۔ مسدس کی ہیئت میں ''مناجات'' کا ایک بند

(۲۳)

اُس دن کے خوف سے میں لرزتا ہوں مثلِ بید
ہو جائیں جس کے ہول سے بچوں کے سر سفید
ہوں آسماں کی زرہ نیلگوں میں چھید
جب اپنے ہاتھ اُگلنے لگیں گے بھید
اپنی جناب میں مجھے رُسوا نہ کی۔جیو
عیبوں کو میرے وقفِ تماشا نہ کی۔جیو

اس مجموعہ میں اپنے عصر کا نوحہ اور عظیم شخصیات کے قصائد کی جھلک نظر آتی ہے۔

''تین شہر''(65ء کی جنگ کا تاثر)

اس میں سیالکوٹ، لاہور اور سرگودھا کی فضاء کی الم ناکی کو اشعار میں ڈھال دیا ہے۔

جس دن سے مد فنِ شہدا ہے سیالکوٹ
آئینہ دارِ نورِ خدا ہے سیالکوٹ

لاہور کی زمین بھی کسی طرح کم نہیں
خاتم ہے ارضِ پاک تو لاہور ہے نگیں
سرگودھا کی فضا کا بھی لازم ہے احترام
اونچا ہے جس کا اوجِ ثریا سے بھی مقام

شاعر کی لفاظی اور فنّی دروبست باکمال ہے جن کا استعمال اس نے ملی راہ نماؤں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ محمد علی جوہر، قائدِ اعظم کے عنوان سے چند نظمیں اور اقبال کے لیے نظمیں ہیں ایک نظم ''اکیس اپریل'' کے عنوان'' سرابوں کے صدف''میں بھی شامل ہے۔

اِک شخص دیکھنے میں نحیف و نزار سا
باطن کی قوتوں میں مگر کوہسار سا

اقبال کے لیے شاعر کی عقیدت دوچند نظر آتی ہے۔

میں وہ محروم کہ پایا نہ زمانہ تیرا
تو وہ خوش بخت کہ جو میرے زمانے میں نہیں

وطن سے محبت کی سرشاری کی کیفیت شاعر پر ایک نشہ ساطاری کر دیتی ہے۔ وہ حُبّ الوطنی کا اظہار والہانہ انداز میں کرتے ہیں۔ پاکستان کی گولڈن جوبلی پر لکھی ہوئی نظم ''آؤ محسوس کریں''اس کیفیت کی آئینہ دار ہے۔

(۲۴)

آؤ محسوس کریں آج کہ کیا شے ہے وطن
ہم پہ اے اہلِ وطن ، روحِ وطن کیوں نہ کھلی
کس تحیر میں ہمیں نصف صدی بیت گئی
کتنا تابندہ و روشن تھا ہمارا آغاز
ہم نے چھوڑے ہیں وطن، روح وطن کی خاطر
پھونک ڈالے ہیں چمن، رنگ چمن کی خاطر

شاعرانہ ثروت مندی کی ثبوت پیش کرتی ہوئی مختلف نظموں سے چند اشعار بطور انتخاب جب وطن عزیز کرب ناک حادثات سے دوچار ہوا۔ یہ فہم وفہراست شاعر کی حساسیت کی غماز ہے کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔

یہ دن کہ ہے جو کفِ دستِ تیرگی پہ چراغ
اسے جلائے رکھو
اس کی لو بڑھائے رکھو
)چودہ اگست(
جبیں میں ایک دریچہ سا کھلا آخر کار
روشنی آئی، ہوا آئی، اُمیدیں آئیں

آنکھ روشن ہوئی سلطانی جمہور کے خواب
دیکھتے دیکھتے تعبیر میں ڈھلنے لگے ہیں
اے وطن ! تیرے شب و روز بدلنے لگے ہیں
)عدلیہ کی بحالی پر(

عید اس بار بھی آئی ہے
مگر رنگِ محرّم لے کر
چاند اُبھرا کسی ٹوٹی ہوئی چوڑی کی طرح
ٹمٹماتے رہے تا صبح ستاروں کے چراغ
)زلزلے کے بعد(

آسمان دل پہ قیامت کی گرانی لایا
جو سنائی نہیں جاتی، وہ کہانی لایا
)سیلاب کے بعد(

''عظمت دور''یوم مئی کے حوالے سے نفسا نفسی اور انسانی بے حسی کو بیدار کرتی ہے وہ انسانیت سے عزت کے طلبگار ہیں۔ نظم کا ہر مصرع لفاظی اور خیال کی بلندی و پختگی میں اپنی مثال آپ ہے۔

(۲۵)

پتھر کی ہتھیلی ہے
لوہے کی کلائی ہے
دونوں کی مشقت نے
کیا جوت جگائی ہے
)مزدور کو عزت دو(

یوم ماحولیات کے حوالے سے ''درختوں کو دیکھو''ایک لازوال نظم ہے۔اس میں مجید امجد کی مشہور نظم ''توسیع شہر''کی جھلک نظر آتی ہے۔

درختوں کو دیکھو
یہ خود دھوپ میں جل رہے ہیں
مگر دوسروں کے لیے سایہ بن کر کھڑے ہیں
درختوں کو دیکھو
خدا کے لیے اس کا انجام سوچو
نگاہوں سے غفلت کا پردہ اٹھاؤ
فضاؤں سے آلودگی دور کر کے
درختوں کے سائے کو آئندہ نسلوں کی خاطر بچاؤ
درختوں کو دیکھو

اس مجموعے میں شاعر ایک مصور کی طرح تصویر بناتا اور اس میں رنگ بھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس میں شاعر کا تخیل، مشاہدہ اور تجربہ ایک کارواں کی حیثیت رکھتا ہے۔

پس نوشت (۲۱)

اس مجموعہ میں شاعر اپنی فنی معراج کے عروج پر نظر آتا ہے۔ وہ لفظوں کو صحیح معنوں میں برتنے کے فن سے بخوبی واقف ہے۔ وہ عہدِ حاضر کی شعری روایت کا امین ہے۔

بقول احمد جاوید: ''ہماری شعری روایت کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ کئی روایتوں کا مجموعہ ہے۔ مثلاً میر کی روایت، غالب کی روایت، اقبال کی روایت وغیرہ اس روایت میں رہنے کے لیے اکثر شاعروں کو کسی بڑے شاعر سے منسوب ہو جانے والی ضمنی روایت کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ اس قبولیت کے کئی اسباب و محرکات ہو سکتے ہیں۔ جن میں کچھ اختیاری اور کچھ غیر اختیاری خورشید رضوی کا تعلق اقبال کی روایت سے ہے''۔ (۲۲)

زیر تبصرہ مجموعہ میں ''سپاس'' کے عنوان سے شامل نظم زبان کی سادگی اور عمدہ لفاظی کا شاہکار ہے۔ یہ مجموعہ غزلیات پر مشتمل ہے۔

(۲۶)

جُھکے کسی کے در پر جبینِ سپاس
فقط اُس کے در پر
جو پتھر میں کیڑے کو
پانی میں گھونگے کو
سیپی میں موتی کو ہے پالتا

خورشید رضوی کی شاعری تنہائی اور حیرانی سے جو المیہ وجود میں آتا ہے وہ شخصی نہیں بلکہ عالمی ہے۔ یہ وہ کیفیت اور وحشت ہے جس سے موجودہ دور کا ہر شخص گزر رہا ہے۔ جس میں کبھی کبھی بے بسی بھی نظر آتی ہے لیکن وہ عزم و ہمت کا پہلو نہیں چھوڑتا۔ یہ ملی جلی صورت حال اس مجموعہ میں جابجا نظر آتی ہے۔

آہستہ ہم سے ملیے کہ رکھتے ہیں ہم بہت
دل میں گریز اور طبیعت میں رَم بہت

دوسری جگہ وہ ایک خوش آئندہ مستقبل کے لیے پُراُمید ہے۔

یہ نہیں ہے کہ اسی راہ پہ چلنا ہے مجھے
اب کسی اور جہت میں بھی نکلنا ہے مجھے
دل کی رفتار سن و سال کی پابند نہیں
ابھی بڑھنا ہے مجھے، پھولنا پھلنا ہے مجھے

خورشید رضوی صاحب علم اور مختلف زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں عربی، فارسی اور ہندی حروف بڑی خوب صورتی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔

کون کہتا ہے کہ پابستہ دریا ہیں گہر

آ، سرابوں میں چلیں آبلہ پاہو جائیں
لبوں پہ شکوہ نہیں دل میں احتجاج نہیں
زمانہ سنگ سہی، میں بھی کچھ زُجاج نہیں
حائل خروشِ دل میں رہے وضعِ احتیاط
جینے کی ہے یہ شرط تو مرجانا چاہئے

خورشید رضوی کی شاعری میں مقصد کی گہرائی پوشیدہ ہے اکثر اشعار میں کچھ کر گزرنے کی تمنا موجود ہے۔

ہوں بھی کہیں کا میں کہ کہیں کا بھی میں نہیں
ہر کام میں لگا کہ میرا کام اور ہے
صاف رکھ صاف خدوخال اپنے
ایک دن، رات کو دن ہونا ہے

(۲۷)

خورشید رضوی کے اندر کی تنہائی اسے ماضی پرست تو نہیں البتہ ماضی گرفتہ بنادیتی ہے۔

نہ جانے اب کے بہاروں میں تم نے کیا سوچا
ہمیں تو اگلے برس کی بہار یاد آئی
یادوں کے الاؤ کو بجھا دوں کہ ہوا دوں
اس نامہ پارینہ کو کھولوں کہ جلا دوں
اے دل برباد ماضی کی طرف مڑ کر نہ دیکھ
اُس گلی میں پھر پلٹ آتی ہے نادانی میری

اس مجموعہ کلام میں دو طرحی غزلیں اور ایک غزل ''بیاد عرفان صدیقی'' کے عنوان سے شامل ہے۔

خورشید رضوی کی شاعری میں تنقیدی بصیرت سماجی شعور اور استعجابی کیفیت کا اظہار ملتا ہے۔

بس اب یہی کہ سب کچھ جلا کے رکھ دیا جائے
پھر اس کے بعد یہ دفتر اُٹھا کے رکھ دیا جائے
تو کیا وہ گھر جسے ہم عمر بھر بناتے رہے
گرا کے رکھ دیا جائے، مٹا کے رکھ دیا جائے

خورشید رضوی کی شاعری میں معنی خیزی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہے۔ قاری اپنی بصیرت کے اس سے معانی اخذ کرتا ہے۔

سوچتا ہوں اُداس جنگل میں
پھول کس کے لیے بنائے گئے
ابرِنیساں کی کوئی منّت نہ احسانِ صدف
میں وہ قطرہ ہوں کہ پتھرایا سو گوہر ہو گیا
عشق وہ بات نہیں ہے کہ جو سمجھا دی جائے

کچھ سمجھنا ہے تو دُنیا سے گزرنا سمجھو

خورشید رضوی ہمہ جہت شخصیت ہیں ان کی نثر اور شاعری کے متنوع پہلو ہیں۔ صیغہ واحد متکلم استعمال کرتے ہوئے وہ ایک تہذیب اور معاشرے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

پتھر تو نہ ہو جاؤں اس جبر کے موسم میں
گو سر نہیں اُٹھا سکتا ، آواز اُٹھا دیکھوں

خورشید رضوی کے تمام مجموعہ کلام دل بنیادی استعارہ ہے۔

میرا رہبر تو میرا دل ہے ، نہ دعویٰ نہ دلیل
تم بھی اِس راہ پہ آؤ اگر اچھا سمجھو

(۲۸)

بحیثیت مجموعی خورشید رضوی کی شاعری جہد مسلسل کا پیغام دیتی ہے۔ پہلے مجموعہ کلام ''شاخ تنہا'' کا آغاز رومانوی غزل سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد آنے والے تمام مجموعوں کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے۔ زندگی میں کچھ کر گزرنے کے لیے عقل کے ساتھ جنوں بھی لازم ہے۔

ہم اہل جنوں ہیں ہمیں فارغ نہ سمجھنا
کر جائیں گے وہ جس کا ارادہ نہیں ہو گا
اب عمر کا انجام ہے، اب کا ہے کا ڈر ہے
جو کچھ کہ ہوا اُس سے زیادہ نہیں ہو گا

خورشید رضوی زندگی کا گہرا فلسفہ ایک شعر میں سمو دیتے ہیں

جو لوگ کم سخن ہیں اُنھی میں ہے کوئی بات
جو بات مختصر ہے وہی سرسری نہیں

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر خورشید رضوی عربی اور اُردو زبان و ادب کے معروف ادیب ہیں وہ ۱۹ مئی ۱۹۴۲ء کو یو پی کے معروف شہر امروہہ یں پیدا ہوئے، اصل نام خورشید الحسن اور ادبی دنیا میں خورشید رضوی کے نام سے شہرت پائی۔

۲۔ ۱۸۶۴ء میں ساہی قبلہ کے نام پر ریلوے اسٹیشن کا نام ساہیوال رکھا گیا جلد ہی گورنر پنجاب سر رابرٹ منٹگمری پر اس ضلع منٹگمری رکھ دیا ۱۹۶۶ء میں عوام کے مطالبہ کی وجہ سے دوبارہ نام ''ساہیوال'' رکھ دیا۔ ۲۰۰۸ء میں پنجاب کی نویں ڈویژن قرار پایا۔

''تاریخ ساہیوال'' مصنف، عادل مشتاق، فریدیہ پرنٹنگ پریس لیاقت چوک ساہیوال، ۲۰۰۹ء ص ۲۰۱۷ء

۳۔ زاہد منیر عامر، ڈاکٹر، تالیف، ارمغان خورشید'' پنجاب یونیورسٹی لاہور ۲۰۱۵ء ص ۵۰

۴۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا مرتب، عبدالرؤف، اشاعت دوئم ۱۹۷۴ء مرتب عبدالرؤف اشاعت سول ۲۰۰۸، مرتب عبدالرؤف، اشاعت چہارم یکجا (کلیات) کی صورت میں ہوئی، اشاعت پنجم یکجا (کلیات) کی صورت میں ۲۰۱۲ء میں، الحمد پبلی کیشنز لاہور کی طرف سے ہوئی۔

۵۔ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر اردو غزل کا تکنیکی، ہیئتی اور عروضی سفر "مجلس ترقی ادب، لاہور ۲۰۰۸ء ص ۲۸۶

۶۔ایضاً ص ۲۸۶

۷۔ایضاً ص ۲۸۸

۸۔ایضاً ص ۲۸۸

۹۔ڈاکٹر خورشید رضوی کا دوسری شعری مجموعہ اشاعت اول ۱۹۸۱ء اشاعت دوم ۱۹۹۵ء اشاعت سول (یکجا میں) ۲۰۰۸ اور اشاعت چہارم ۲۰۱۲ء (یکجا) میں ہوئی۔

اس مجموعے میں ۳۹ غزلیں، ۲۳ نظمیں، ۷ نوحے شامل ہیں۔

۱۰۔خورشید رضوی، ڈاکٹر، دیباچہ، گزارش احوال، سرابوں کے صدف، مشمولہ، یکجا (کلیات) الحمد پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۲ء ص ۱۱

۱۱۔رفیق سندیلوی، سرابوں کے صدف، (مضمون) مشمولہ، ارمغان خورشید، لاہور، ۲۰۱۵ء ص ۱۴۲

۱۲۔ڈاکٹر خورشید رضوی کا تیسرا مجموعہ کلام، اشاعت اول ۱۹۹۶ء (دیکھیے ارمغان خورشید، ص ۱۷۰ اشاعت دوم، مشمولہ یکجا (کلیات) ۲۰۰۷ اشاعت سوم، مشمولہ یکجا (کلیات) ۲۰۱۲ء لاہور ۲۰۱۲ء ص ۱۱

۱۳۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کا چوتھا شعری، مجموعہ اشاعت اول جو ۲۰۰۴ء، اشاعت دوم، اشاعت سوم یکجا (کلیات) میں ۲۰۰۷ اور ۲۰۱۲ء میں ہوئی۔

۱۴۔اعجاز حسین بٹالوی، پیش لفظ مشمولہ، یکجا کلیات ص ۱۳

۱۵۔ڈاکٹر خورشید رضوی کا پانچواں شعری مجموعہ، ناشر، القا پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۳

۱۶۔ڈاکٹر خورشید رضوی کا چھٹا شعری اور پہلا نعتیہ مجموعہ ناشر، انٹر نیشنل نعت مرکز، لاہور ترتیب، ارسلان احمد ارسل، ۲۰۱۵ء

۱۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، نیشنل بُک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ص ۵۰۰

۱۸۔ڈاکٹر خورشید رضوی کا ساتواں شعری مجموعہ جو قومی و ملی نظموں پر مشتمل ہے۔

۱۹۔ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر، شناخت، انٹر نیشنل نعت مرکز لاہور ۲۰۱۹ء ص ۱۸، ۱۷

۲۰۔ڈاکٹر خورشید رجوی کا آٹھواں شعری مجموعہ، اشاعت اول، القا پبلی کیشنز لاہور 2019ء

۲۱۔خورشید رضوی، ڈاکٹر، پس نوشت، ص ۲۱، ۲۲ ایضاً